

اندھیری رات میں جیپ بیان بجھنے سڑک کے کنارے  
 تو جیپ میں سے تینی آدمیوں نے بھل کر خارشی سے قیدی  
 سب جیپ کے اندر اپنی اپنی چکر پر بیٹھ کر تو جیپ داں سے  
 بھل کر چھیلیں اور بھن کی اوانت نے فضائیں شور برپا کر دیا۔  
 ہر دنی ہو۔ سڑک، جو دن کی روشنی میں گھر سے نیلے رنگ کی تھی  
 کئے پھٹھے ہوئے جیپ بیٹھ کی شکل میں سڑک پر اور پھر ان  
 آنکھوں کے آگے اندر انتہا۔ یہ کیسی جیپ ہے، اس نے سوچا  
 پہلا ہے۔ الیسی جیپ میں نے پہلے نہیں دیکھی  
 درمیان بھنس کر بیٹھا سامنے لکھتے ہوئے بیاہ پرے کو دیکھا  
 یہ بھٹے کہاں لے جا رہے ہیں، اس نے سوچا۔ ساتھ ہی ساتھ  
 دخون تھا نہ براں، بس معمول جسم تو سختی جیسے وہ کوئی عام سا  
 دقت ایک ساتھ کئی باتوں کے ہونے اور نہ ہونے کا شماں برا  
 نسل چکا ہے اور اب براں کی کیفیت کی جا پرچ کر سکتا ہے جو  
 اس نے محسوس کیا کہ جیسے بال کی سی باریک ہے شمار تاروں نے  
 رکھا ہے اور ان کی تار پر اس کا بدن مکمل توازن کی حالت میں  
 بات کا خذش تھا کہ اگر اس نے ذرہ بھر مزاحمت بھی کی تو  
 ایک شکل مدت نہیں ایک بار پہلے تو کپیں کے زمانے میں اسہ  
 پڑھنے چایا کتھا اور یہ کیفیت دخون کرنے کے بعد اس پر طاری  
 قائم رہتا تھا۔ بہترین دروازہ مسجد کا تھا، اس نے پہنچے آئی  
 نے سختی سے سر مورکر اسے دیکھا۔ وہ بے جنبش سامنے دیکھتا  
 کے ہاتھ سے بھل کئی سختی، اس نے سوچا۔ اب اتنی عمر کے پہنچے  
 ایک اونکھی آشنا فی کی بھر جپل رہی ہے جس نے اس کے  
 میں ایک لمبی اور اپنچی اڑان سختی، جیسے کری بلند پرواز پر  
 بھرنا ہر ایک لمحت کی منہم پر بخوبی رہوا۔ میں مغلق برجا گئے گے

کے کھڑی تھی، فخر وں رالے جب کی رنگ پر ساکھ پڑھے  
کو دھول کیا۔ درائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا، جب وہ  
کے روانہ ہوئی۔ بے درانہ چہرے میں رذشی کی لکیریں  
سد کو قیوں محسریں ہوئیں ہی سرفی ہوئی رات اٹھ کر چل  
تھی، اب سیاہ نظر آرہی تھی۔ قیوں کی رذشی ایک  
دل کی دیواروں پر آرٹی پلی جا رہی تھی۔ مگر انہوں نے اسکی  
پیاری جس کی الگی اور پچھلی سیٹ کے نیچے  
وہ پچھلی سیٹ پر دو آدمیوں کے  
بیٹھے جا رہا تھا، جیسے رام کی کھڑکی کے ٹھنڈے کا منتظر ہو  
رہا یہ جان کر نے سے چہرتے بھی ہوئی کہ اس کے اس سوال میں  
سوال کسی سے پوچھ رہا ہے۔ اس کے ہدن میں اس  
علم موجود تھا۔ اس نے خیال کیا کہ وہ اپنے جسم سے  
اس پر گزر رہی ہے۔ ایک گز مذکونہ کیفیت اُرام کی تھی۔  
اس کے مخور کو چاپروں سست سے اپنی اپنی طرف پھیٹخ  
یہ ہلکا چھلکا اور آسان پڑا ہے۔ مگر ساتھ ہی اسے اس  
عن آسانی کا یہ علم نہ پھوٹ جانے گا۔ اس کیفیت کی  
نے دیکھی تھی۔ اس وقت وہ ہاتھ عدگی سے مسجد میں نماز  
تھی ہوتی تھی اور اس وقت تک۔ ہتھی تھی جب تک دخوا  
پ سے کہا۔ دلوں بازدھوں پر نیٹھے ہوئے آدمیوں  
اہڑا بیٹھا رہا۔ کسی وقت میں جا کر فخر رہی کیفیت اس س  
جھے ایک بار فخر اس نے محسریں کیا کہ اس کی جلد کے نیچے  
جسم کو بے دن مگر دل کو تو اماکر دیا ہے۔ اس کے دل  
وہ جس کے شرپوں میں اتنی توت ہر کو فضا میں نہیں  
اگر یہ آسان کے پیچ کوئی درداڑہ نہ کل آیا جو اور وہ تلویر

وہاں پر رُک کا اس کے اندر دیکھتا رہے۔ سب سے بہتر دروازہ مسجد کا تھا، اُس نے سوچا۔ گلی کے موڑ کی گولائی میں جڈا ہوا دروازہ میلے دہرے رُخ کا تھا کہ دونوں گھبلوں میں حسوس مقام سے دیکھیں پورے کا پورا سامنے نظر آتا تھا دروازے کے اوپر گرد سفید پھر کی ہللوں پر زیگن پتھی کارہی کا کام تھا۔ زنگ کیسے تھے ہے برا اور نیلا اور قمری زنگ تھے جن کی شاخ بیلیں ہاروں کی مانند دروانے سے کے گرد لٹکی تھیں۔ مگر بات یہ نہ تھی کہ پھر کے اندر شوخ بیلیں تھیں اس وجہ سے دروازہ بہترین تھا۔ بات یہ تھی کہ دروازہ کبھی بند نہ ہونا تھا۔ رات کے وقت جب سارے گھروں اور دکانوں کے دروازے بند ہو جاتے تو اس وقت بھی یہ دروازہ پورپٹ رہتا تھا۔ انہیں سکتی تیز ردشی مسجد کی سفید دیواروں پر ڈلتی تھی۔ اور رات چاہے کتنی ہو جائے کوئی نہ کوئی انہیں چل پھر رہا ہے تھا۔ صبح دوپہر شام ہر وقت کوئی نہ کوئی نگکے پاریں دھرتی اڑتے کہنوں سے پانی کے پر کے نکال نکال کر لٹکی میں ڈال رہا ہوتا تھا اور ہر کوئی انہیں جا کر غسل خانے میں نہا سکتا تھا۔ نماز پڑھنے کی پابندی نہ تھی۔ زیادہ نرگل خاص طور پر گرمیوں میں صرف نہانے کے لیے وہاں جاتے تھے اور نہا کر جھیگے مدن چلپی پہنے پیڑھیاں اتار کر گھر پلے جاتے تھے۔ سرانش جھٹے کے دن کے جب مغلے کے پھرٹے بڑے اپنے اپنے گھروں سے صاف کپڑے پہن کر مسجد میں جاتے تھے اور کئی ایک دن پر دوبارہ دھو کرتے تھے۔ پھر سرودی ہو تو صحن کے نیچے دھوپ میں اور گرمیوں کے دونوں میں برآمدے کے تلے سائے میں گھس کر میختے کی کوشش کرتے اور مٹھا کر خطبہ سنتے تھے..... آشانی کی لمبڑی کے پانیوں کی جانب سفر کر رہی تھی اور اپنی رُو میں چھوٹی بُڑی مدنوں اشیاء کو بلطفتی جاتی تھی، مگر یا کسی نادر اور قیمتی شے کی تلاش میں ہو۔ اسے اپ کو اس لمبڑی کے پانیوں کے دن بھی چھوٹی چھوٹی شے کر اٹھاتا، اُسے اٹھا پہنچتا اور دیکھتا بجا تھا لمبڑا چلا جا رہا تھا، جیسے کوئی خزانہ اس کے ہاتھ مگک گیا ہے۔ یہ لمبڑے نڈگ کی گھروں کی جانب روان تھی۔ اس نے خیال کیا کہ جیسے ایک مہیب اور مٹھا زور پھلی ہے جو خون طلگا کے پنسے پر دن کے زور پر اندر بھی انہیں اتری چل جاتی ہے اور وہ اس پھلی کی لپٹت پر جم کر بیٹھا۔ اس نئے راستے کے نشان اٹھا تا چلا جا رہا ہے۔ جھٹے دالے دن، اس نے خوشی سے سوچا، دروانے کے اندر پھرٹے بڑے بے شمار جو توں کا جگہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی یہ پھیل کر دروازے سے باہر پڑھیوں تک چلا آتا تھا۔ وہ جن کی بلکی بلکی سستی چپداں ہوتی تھیں اُن کو یہیوں کے اس پاس لاپرداں سے آتا کہ اندر پلے جاتے تھے مگر جن کے پر دن میں بیکھے بڑت ہوتے تھے وہ انہیں آتا کر اُن کے تلے ایک دوسرے سے ملا کر اتھے میں پکڑ لیتے تھے اور مسجد کے اندر لے جا کر ایک طرف دیوار کے پاس رکھ دیتے تھے تاکہ محفوظ رہیں۔ جھٹے کو مسجد کی دیواروں کے ساتھ ساتھ ایسے بوٹوں کی قطار لگی

ہوتی تھی جو پہلو کے بیل پڑے ہوتے تھے اور میرے دل میں ہر وقت خیال آتا تھا کہ نہ دھوپا ہے نہ کلمہ پڑھ کر لپک سکتا ہے بس تکنے سے تلا جوڑ دینے سے یہ پاک کیسے ہو گئے۔ مولوی سردار شاہ کی ڈاڑھی کے بال سفید تھے اور سر پر بڑی سی سفید بل دار گپڑی ہوتی تھی جس کو وہ کبھی کبھی آتا کر گو دیں رکھتے تھے اور چھوٹے چھوٹے کھپڑی باوس میں انگلیاں ڈال کر سر کم جاتے تھے۔ مگر گپڑی ڈسیل ڈھان ہونے کے باوجود خراب نہ ہوتی تھی بلکہ اسی طرح دوبارہ سر پر چھم جاتی تھی۔ اللہ میاں کی شکل اُس وقت مولوی جی کی شکل کی سی تھی۔ بڑی سی ڈھیلے میوس والی سفید گپڑی اور سفید ڈاڑھی اور پستہ قدر گندھا ہوا بھاری جستہ اور نیلا کڑا نیلا تمہارہ اور اللہ میاں کا ایک ڈنڈا تھا۔ میں اور ماں اور ساواں اور کہہ پہا اور بکھری تشدید والی کی رٹکی اور شجو ان دونوں ظہر کی ناز کے بعد مولوی جی سے قرآن شریف پڑھنے چاہیکر تھے اور کئی اور نیچے دوسری گلیوں سے بھی آتے تھے۔ پہلے کوئی درویش کچھ درس دیتا تھا جب تک کہ سارے نیچے ایک ایک لکھ کے آرہ جاتے تھے۔ پھر مولوی جی جھرے کے دروازے پر آ کر اذراً نے کا اشارہ کرتے تو ہم سب اُنھوں کو جھرے کے اندر چھائی پڑا بیٹھتے تھے۔ پھر چھائی پر ایک چوکر گذا اور مولوی جی کے بیٹھنے کے لیے تھا اور پہنچے ایک گاؤں تکہہ تکھے کے اور دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جہاں سے میں اتنی روشنی پرلی تھی کہ شکل سے حرف نظر تھے اور دروازہ اندر سے بند کر لینے پر جھرہ اور بھی تماریک ہو جاتا تھا۔ پھر یہ کھلے بہن میں یا لگے میں جو کوئی لگنے لگتا تھا اُس کو مولوی جی کی پہنچی گمراہ سب دارِ دان کی آواز پڑتی تھی۔ اللہ میاں کا ڈنڈا اُسے اُندھہ بان بندی کی اس آواز پر لگنے والا اپنی چگیر چھوڑ کر مولوی صاحب کے پاس جا بیٹھتا تھا۔ وہ اُس وقت تک دہان چپ چاپ پیٹھا رہتا تھا جب تک کہ کسی دوسرے نکنے والے کو آواز نہ پڑھاتی تھی۔ جب کہ اس درمان میں سب ڈر کے مددے ایک ساتھ آپنی آواز میں کوئی بہاں سے کوئی دراں سے اپنا اپنا بہن دہراتے جاتے تھے گو۔ اللہ میاں کے ڈنڈے کی شکل کسی نے نہ دیکھی تھی۔ تاہم سب نے کسی نہ کسی وقت میں ڈرے ڈرے باختوں سے اسے پکڑ کر رکھا تھا جیسے کہ کوئی آگ کا کوڑا جو جس پر اتھ رکھ دینا ہی بڑی سزا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی ایسی سزا نہ تھی کیونکہ اس سے کہیں درونہ اٹھتا تھا اور اس سے بڑی سزا مولوی جی نے کبھی نہ دی تھی۔ سوئے اُس وقت کے کو جب بیٹھے بیٹھے کبھی کچھار وہ اتھ کو سختی سے جھینک کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور تیزی سے جھرے سے نخل کو غسل کے لیے پھلے جاتے تھے اور پھر واپس ڈکر درس دینے لگتے تھے۔ یا سوائے اس حکم کے کہ اس کا نام زبان تکم آیا تو اس کی مدرسی آنما فانا پڑھے گی کہ ماں باپ انھے ہو جائیں گے اور گھر کا جو جائے گا اور تم گلیوں میں بھیک مانگنے پھردے گے۔ ہمارے دل میں اس کا ذریعہ بیٹھ گیا تھا۔ مگر دوسرے درد میں کیمانند نہیں تھا جن سے دل میں نہیں بلے خوف پہنچا ہو جاتے ہیں بلکہ چھوٹا سا ڈر تھا جیسے کوئی راز ہو اور دل میں تسلی تھی کہ جب تک اس کا ذکر زبان تکم آیا کچھ نہ ہو گا۔ وہ سبتوں



پکن گل کے مروی سنا یت شاہ سے مناظرے شروع کر دیے۔ منظرے شہر سے باہر بیک گھٹے میدان میں ہوتے تھے جو پڑا کہلا تھا۔ ہر جھنے کی نماز کے بعد دونوں اپنی اپنی کابوس اور پسے اپنے دردشون کے کردہ بیک جایا کرتے تھے۔ پہلے کچھ درستک وہ بیک دوسرے سے بحث مباحثہ کرتے اور کتابیں کھول کھول کر حوالے دیتے۔ پھر دونوں خصے میں آ جاتے اور لعن طعن کرنے لگتے۔ دونوں طرف کے دردش و نڈے اور سو نیاں نکال لیتے اور کبھی نیچے بچاؤ ہو جاتا مگر اکثر ذہبت رائی پر جا پہنچتی تھی۔ پھر منظرہ لگجھے تک آٹھا دیا جاتا۔ مولانا علی محمد بریلوی، سرداری ہو یاگر میں مسجد کے صحن میں بٹھا کر اپنی تیز تیر آواز میں قرآن شریف کا درس دیتے تھے اور جو کوئی لٹکنے لگتا تھا اس کی پیشہ پر بیک پہلی سی قمی تراث سے لگاتے تھے۔ اس سے سبقت یاد ہو جاتا تھا مگر فقط دل پر کندہ نہ ہوتے تھے۔ وہ محنت وہ بحث اور اندسے تکلیفی تھی..... اس مشماقی ہوئی نیم روشن دنیا میں دفعہ اس کو حکم سہوا کر دہ قیمتی اور نادرتے بحث کے یہ نشان تھے۔ کچھ دیر پہلے بیک شعلوں کی کیبر کو جگل کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ کر اس نے سوچا تھا، اب میں کس بات پر اپنا یقین رکھوں گا؟ اب سہپیوں کی طرح بھری بُری عمر کی ان گھریوں کو وہ بیک ایک کر کے چھتا اور ان کے نزد کھولتا ہوا آزادی سے چلا جا رہا تھا، جیسے یہ سخت سب سے ہل اور آخری سخت ہو۔ یہ نشان جاذر تھے۔ سوچی کے ہاتھ کے کو بیک پار میں تھے، اس نے سوچا، آنکھ کے ٹگ کر دیکھا تھا جس کے اندر سے اُسنوں کی قطاریں گزرا ہی تھیں اور بیک قافد تھا عورتوں مردوں اور بچوں کا جن کے چہرے اُرثی ہوئی زور آور خواہش میں ڈھلنے تھے جیسے رہزوں کے ہوتے ہیں یا چھوٹے بڑے مختاروں کے اور ان کے سردوں پر بال آندھی کی طرح بکھرے تھے۔ یا سہیں کی چھاتی پر بھی بال ہیں مگر ہلکے ہلکے نہرے زنگ کے پیشم کے جلدے کی مانند چوڑھر فروٹی کی آڑی شعاع میں چکتے ہیں۔ یا سہیں سیدھی پیشہ پر لیٹھی تھی اور پتے پتے نیم زرد رنگ آموں کی چھاتیاں جن کا گندھا ہوا جنم اتنا مختصر تھا کہ دونوں بیک سمحی میں سا جائیں مگر دو دو تھیں اور بیک دوسری سے پرے مٹنے کے بیکوں کی جانب کو جملی تھیں ایسے بکے سے خم پر کگمان ہوتا تھا ابھی دھلکیں کو دھلکیں گر سختی سے بندھی تھیں اور اپنی بادامی زنگ کی سہیں نو پیاسی آنکھیں اٹھاتے تندہ ہی سے باہر کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی زندگی کا غذ کی سی جلد تھی جس کی سلسلہ پر نیلی اور قرمزی شریاں کا جاں بچا نظر آتا تھا اتنا صاف کہ جیسے ہر نوں سے کیا جائے گا۔ ایسی بیک اور بادامی آنکھیں میں نے نہیں دیکھیں۔ میں نے دیکھی کہتی ہیں۔ دوچار پہنچا بیک بیک نیچے کو دھلکی ہوئی تھی اور خون میں ڈوب کر مچھٹ گئی تھی۔ دوکل آنکھیں نہیں تھیں، صرف تانے کے پیسے چتنے گول گول چپٹنے تھے اور چاند کی روشنی میں بھری ہوئی گاڑھی دودھیا چیند بھی جس کے اندر کہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ وکیمی میں نے دراہل دو

ہیں، مگر شرپاؤں کے جاں سے رستی ہوئی روشنی ساری بستی ہوئی اگر ان آنکھوں کی نینبوں پر سمجھدہ ہو گئی تھی اور میرے اندر ہر اسکس یا کس علم کے مطابق تھا کہ سارے جہاں کی آنکھیں میں نے دیکھی ہیں۔ چہروں کی رات اور ہے مجھے اُس بڑھتے شخص کے چہرے کی آنکھیں یاد ہیں جو خاکساروں کے پڑھے پہنچنے کیلئے بیچا کرنا تھا۔ وہ خاکساروں کے پڑھے پہنچنے روز شہر کے بازاروں میں یا کس قلعہ لگانا ہوا اپنے فٹے ہٹے کیس میں لکھی ہوئی عینکیں بیچا کرنا تھا۔ اُس کو عینکیں بیچتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا تھا مگر اُس کے فٹے سے ہر کوئی واقعہ تھا جس کا عینکوں سے کوئی واسطہ تھا۔ وہ ہماں سکول کے سامنے ایک کرے میں رہتا تھا اور ایک روز صبح سوریے سکول لگنے سے پہلے ہم وہاں کھیل رہے تھے کہ ایک پولیس کی گاڑی آئی اور اُسے پکڑ کر لے گئی۔ جب گاڑی پلی تو ایک منظر میں کھڑکی کے شیشے سے منہ لگا کر اُس آدمی نے پوری آواز میں اور درسمی کے سے پہنچا کر لگایا: ”چور پچھے چودھری تے لندھی رن پر دھان۔“ بندگاڑی سے اُس کی گھٹی ہوئی آواز باہر نکلی تو ماں کھڑے ہوئے دگ ہنس پڑے۔ اُس وقت کی اُس کی آنکھیں مجھے یاد ہیں۔ اُس کے چہرے سے سارا جوش اور خبر و فتنہ ہوا ہو گیا اور ہنستے ہوئے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھوں میں ایک تحریر پھیل گیا، جیسے کسی اٹھ تدریجی حادثے کو پہلی بار اُس نے دیکھیا ہوا اور روح اُس کے جسم سے نکلتی جا رہی ہو۔ جس خون کرنا عمر نے اور دنہاں کی دھنٹ نے سست کیا تھا چند کھنڈرے دگوں کی بے ختیا بنسی نے سرد کر دیا۔ اُس عمر میں نے ان آنکھوں میں ایک آدمی کو زندگی کی حیرانی کا سامنا کرتے ہوئے دیکھا تھا، اور میرے دل میں سب آدمیوں کی زندگی کے بارے میں وہ سو سپیدا ہو گیا تھا۔ چہرے کی اور بدن کی آنکھوں میں اتنا فرق ہے ہم یا سجن کو کیسے پلکر دیں ہے مجھے یہ بھی علم نہیں کہ ہم کہاں جائیں ہے ہم۔ یہاں سے کچھ نظر نہیں آتا۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہاڑوں سے اتر رہے ہیں۔ اگلی بیٹ دلے آدمیوں نے اب آہستہ آہستہ ہمیں شروع کر دی ہیں۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمیوں نے بھی لگئے آدمیوں سے ہمیں کی ہیں۔ میرے سامنے سے ماخا بڑھا کر ایک دسرے کو سگریٹ دیے ہیں اور سلگائے ہیں۔ تیل کی روشنی میں ہم نے ان کے چہرے دیکھے ہیں۔ معمولی چہرے ہیں۔ ان کے چہروں سے اور باڑوں سے پتا نہیں چلتا کہ پولیس کے ہیں یا فوج کے اتنا پہاڑیں رہا ہے کہ ہم ہر چھوٹی سے اترانی کو جا سکے ہیں۔ جیپ کی آواز ایسے آرہی ہے جیسے ٹرک چل رہا ہو۔ یہ کون دگ ہیں؟ ..... اسد کے دل میں یہ شک تھا کہ ہونہ ہو اس مدد میں کا لمحن فوالفقار سے ہے۔ اس خیال سے اُسے کچھ تسلی ہوئی، جیسے اُس کو یقین ہو کہ ذوالفقار اُسے نگز۔ سنبھے دے گا جیپ کا رخ تو میدانوں کی طرف ہے، اُس نے سرچا کیا یا اب مجھے گھر چوڑ کر رہیں گے؟ مگر اس طرح قیدی بن کر لے جانے کی خواہ درت ہے۔ یہ عجیب سفر ہے۔ شاید ان کا خیال ہو کہ قیدی میں دال دال کرہ مجد کو ایک بے خبر اور گند آدمی بناؤں گے۔ ان کو خبر نہیں کہ میرے ذہن میں یہ بت بھل

چھکتی ہے جس کے اندر بجھے چڑیں نظر آتی ہیں۔ یا سین کی شکل اور دوسری نشکلیں جو میں نہیں ہوتیں۔ اس وقت میرا خیال اٹک رہا ہے۔ جب روشنی ہوگی تو اس میں ایک روانی آجائے گی جیسے دریا میں ہوتی ہے۔ پھر اس کے زور کے آگے پکنے والیں مُھرے گھکھلی تک ان کی رسائی کیسے ہوگی؟ اس روشنی تک یہ کیسے پہنچیں گے جس میں جگہگاتی ہوئی لمبی گول رانیں قلبی کے چھلوں کی مانند کھلتی اور بند ہوتی ہیں۔ قلبی کے یہ پہلے انہیں کہہ کرے یہیں بھی جس میں جملاتے ہوئے یہیں نے دیکھے تھے جب گمبوں کی سرپرہ میں فیض نہیں آ رہی تھی۔ ابا ہر آدھ کھنے کے بعد جھاٹک کر دیکھ کر تھے اور نہر اور حصر کی نازکے بعد دعا پڑھ کر، چلپے ہے میں سریا ہوا ہوں یا جاگتا، مجھک کر نہیں کرنے آیا کرتے تھے۔ اس ساری سرپرہ کو آبائیں آئے تھے اور میں نے ان کی مجھک کا دروازہ جاکھو لا تھا مگرے میں پسند کی اور پکے کافی ہوئے آلوؤں کی سی بلکی بلکی بوجھی تھی اور دیوان کے اوپر دو پھول ہوئی گول گند می رانیں کھلتی اور بند ہوتی تھیں اگرچہ کھڑک کے شیشوں پر کڑا دال کر روشنی کو فیض کیا گیا تھا۔ ابا ایک سیکنڈ کے اندر آگے آگئے تھے۔ ان کے چہرے پر سایکلی تھی مگر اسکھوں میں پیار کی مُھری ہوئی سُست نظر تھی جس سے میرے دل کو سلی ہوئی تھی کہ کوئی بات نہیں، سب سلیک سُناک ہے۔ اندر چہرو اگرچہ تغیر نہیں آتا تھا مگر بجھے علم تھا کہ یہ کون ہے۔ یہ چڑاغ تھی۔ چڑاغ کی بھاری بھاری چڑھی چھاتیاں تھیں جو کھنے سے گزتے کے اندر بلکی رہا کرتی تھیں۔ وہ دن بھر گلی میں اپنے تھڑے پر میٹھی رہتی تھی اور گزتے ہوئے پتوں کر اور بجھے خاص طور پر اچک کر اٹھا لیتی تھی اور بھیٹھی بھیٹھی کر پیار کرتی تھی۔ میں اس کی گود سے نکلنے کے لیے اخیر پاؤں ماکڑا تھا اور جیسے ہی میرا پاؤں زمین پر لگتا میں چلانگ کار کر جاگ آتا تھا۔ کیونکہ چڑاغ کی چھاتیاں اگرچہ ہوئے ہوئے زم گدوں کی سی تھیں مگر بجھے علم تھا کہ وہ اپنی بیٹھی کئے پھر کو مارا کر لی ہے اور اپنی بیٹھی سے ہر وقت لڑتی رہتی ہے۔ اس کی بیٹھی کا خادمہ پُر ارہی تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ چڑاغ کے دو کمروں اور چوبیوں والے گھر میں رہتا تھا اور ہر چوتھے پانچوں روز اپنی بیوی اور ساس کر پہنچتا تھا۔ وہ انہیں شور مچا چاکر گالیاں دیتا تھا مگر کوئی کا کوئی دوامی پچھڑانے کو ان کے گھر کے پس نہیں پہنچتا تھا۔ اسی طرح گھل کے سب لوگوں کو چڑاغ کی اس بات کا بھی علم تھا مگر بجھے نہیں تھا۔ بجھے اسی دن ہوا جب ابا، جو پارچے وقت کے نازمی تھے، بازاری لوگوں کی طرح غصب کی حالت میں گالیاں دیتے ہوئے بندوق اٹھا کر باہر نسلک گئے۔ جان ان کے پیچے پیچے بجا گا اور جاتے جاتے گھر کے دروازے کو باہر سے گندھی لگانا گا۔ مگر میں نے اور بھوپالی اُمانے روتنے گھل والی کھڑک کی سلاخوں میں سے دیکھا کہ ڈپو والے صوفی فضل کرم، جن کی شخصیت سفید و اڑھی تھی اور لوگ بکتے تھے کہ دیکھ کرستے ہیں، اسی طرح غصب و غصب کی حالت میں دوسری طرف کھڑے تھے۔ وہ اپنی قبیض کے ہن

کھول کھول کر اور سینہ نشکا کر کر کے بیچ دیہتے تھے، مار، گولی مار، ویکھوں تیری بہادری، اور بہت سے لوگ  
بیچ بچاؤ کر رہے تھے اور اپاکی نہاد قی سیدھی دہونے دیتے تھے۔ تماشا یوں میں ایک آدمی ہماری  
کھڑک کے آگے کھڑا کہہ رہا تھا، خدا کسی کو توفیق نہیں دیتا اس چڑیل کو نکاح کر کے گھر لیں ڈال لے، عزت مار  
لوگوں کی عاقبت خراب کلتی ہے۔ اس شخص نے کسی کا نام نہ لیا تھا مگر مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا کہ اس کا  
مطلوب چراغ سے ہے۔ میں نے مذہ اٹھا کر پھر بھی ارمکے چہرے کی طرف دیکھا تھا اور ان کی بھتی ہمیں ویکھوں  
کو دیکھ کر میرے دل کر جیوانی ہوتی تھی کہ پھر بھی ارمکے چہرے کی طرف دیکھا تھا اور ان کی بھتی ہمیں ویکھوں  
کا کوئی آدمی آنکھ اپنچی کر کے نہیں گوار سکتا تھا، سب دگروں کو اپاکی او صوفی فضل کریم کی اور چراغ کی اس بات  
کا علم تھا اور کوئی کچھ نہیں کہتا تھا، بلکہ بیچ بچاؤ کرنے آپتے تھے۔ یہ سوچ کر میرے دل کو بڑی بھروسی  
ہوئی تھی، جیسے میں کسی قلعے کے اندر محفوظ پہنچا ہوں۔ اس روشن اچانکہ دروازہ کھولنے پر انہیں کہے کہ میں  
اگر چہ سکل مجھے نظر نہیں آئی تھی اور رانیں میں نے شلی پہنچ کبھی نہیں دیکھی تھیں مگر مجھے علم تھا کہ کس کی ہیں۔ صرف بوئی  
تھی۔ پیسے کی بوئے میں واقع تھا مگر کافی ہے کچھ کچھ آنکھ کی طرح کلدہ باس نہیں تھی۔ میراجی تھوڑی دیر کے لیے  
ستلانے لگا تھا۔ مجھے اچانکہ خیال آیا تھا کہ میں درزخ میں جاؤں گا۔ اس عمر میں جب مجھے کسی بات کی خبر ہو  
ہی تھی مجھے ایک اشارہ ہلا تھا کہ کچھ درگ ہیں جو درزخ میں جائیں گے۔ مگر اس اشارے پر میرے دل کو کوئی  
پیشانی نہ ہوتی تھی۔ جیسے کوئی معمولی بات ہو، یا کوئی ایسی بات ہو جس کا کوئی علاج نہ ہو، جیسے کھڑکی کیوں ہو رہی  
ہے، کوئی مقام آگیلہ ہے، کوئی مقام نہیں آیا۔ جیسے شرک کے کنارے پر آڑکی ہے اور ہمین آدمیوں نے اڑ کر  
ذعلان پر پیش اب کیا ہے۔ یہ پیش اب کا مقام ہے۔ اب تک میں اور جیسے کے ہر کھڑکے آہستہ آہستہ باقی کر رہے  
ہیں۔ چوتھا آدمی میرے پاس پہنچا ہے۔ اس کو پیش اب نہیں آیا۔ اگر آیا ہے تو کافی نہیں گیا، میراجی حفاظت پر  
عامدہ ہے۔ اب میں بھاگ کر کہاں جاؤں گا؟ میرے پاؤں میں دوداگرچہ مذکور گیا ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ گیا  
نہیں، پیسے ہو گئے ہیں مابہ ان لوگوں کی بات کی غدر ہے۔ میرا خیال پھر اچانکہ راہے، جیسے نیم جان ہو گیا ہو۔  
پیشہ کا ہون ٹڑا جان وار جدن تھا، پیشہ پھر یہ کا تھا، مگر جب کافی تھی میں گیا تو دو اور لوگوں کے ساتھ شہر ہیں ایک  
چڑیاڑہ کرائے پڑئے کر رہا تھا۔ میں پیشہ سے ملنے والے جایا کرتا تھا تبین دیواروں کے ساتھ میں چار پانیاں مجھی تھیں  
جن پر سفید چادروں اور پارامی کھیسوں کے پترتے تھے۔ پھر ایک چار پانی کے پاس ایک ایک میز پڑی تھی جو آتشی اور گلابی  
رنگ کے کٹھے ہوئے ہمہ لوگ والے میز پشوں سے دھکی تھی۔ میز والے کے اور پکاپیاں، کتا میں، سگریٹ، خاڑ مٹھیں ہیں،  
چکلے، لفائنے اور پیٹر کے سکے بیچ میں ایک اور میز تھی جسے اپنچی پنچی ایکٹوں دلے فرش پر جا کر دو گوسیاں

ئنسے سامنے رکھ کر اور چار پانیٰ گھبیٹ کر جم چاروں اُس کے گرد پیچھے کرنا شکھیلا کرتے تھے۔ سامنے والے مکان کے چوبارے میں ایک شام کو بہمنے دینگھے پدن چلتے پھر نے ہوتے دیکھے تھے۔ ساری دنیا سے بے خبر دہ آدمی شست کھڑکی کی جانب کیے اتنا کوہپوس پر رکھتے تھے تاکہ کھڑا تھا۔ عورت اُس کی ماگروں کے بیچ اپنے گھنٹوں پر کھڑی اپنے سنیدھاں اُس کی کمر کے گرد ڈالے، مہندی لگئے اتحوں کی انگلیاں اُس کی پیچھوے کے گوشت میں گاڑے غصیلی کے طرح غزاری تھی۔ اُس کا چہرہ آدمی کے ذخیر کی ارت میں تغیر نہیں آتا تھا، اگر اُس کے سر کا درز نما ذخیراً تباہ اسایہ بغل کی دیوار پر ناچ دھانچہ جبکہ گلی کی اس جانب پہنچنے چوبارے کی کھڑکی میں بھی بھدئے چار فوجان چون، بشیر، روف، رشید اور میں اتحاد راؤں میں وہاں پہنچنے کیجھتے تھے۔ بشیر کے چوبارے کی ایک ایک چیز بچھے یاد ہے، مگر اس طرح سے کہ جیسے بشیر کے لیے اُس سامنے والے چوبارے کا شونما پس منتظر گئی ہو۔ اُس ایک شام کے چند لمحوں میں اُنمی جان تھی۔ بشیر چھرپیے کا تھا جو بمارے گاؤں سے چار کوس کے فاصلے پر تھا۔ ان دونوں ابھی دھویں میں پڑھتے تھے کہ بہارے گاؤں کی جھریلی سے کبھی پڑھی تھی۔ ان دونوں جیس بشیر کی قلچی دودر دودر تک مشہور تھی۔ مگر اُس دن میری قلچی اس ذھب سے اُس کو ٹکر دو جنہش رکر سکا۔ ان دونوں نہر کے اندر تیر بشیر کر اور کھیتوں کی شکل مٹی میں دودر دودر کہ بہاری راؤں میں ایسا زور پیدا ہونے لگا تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ فیض چھوٹا سا پریت پیچی میں آجائے تو خپڑہ ہو جائے گا۔ کبھی کھلنے کے بعد جب کنٹوں پر مل کر نہاتے اور پھر دبھی کی گاڑھی لئی کے کھڑے چڑھا کر کسی درخت کی تھیاروں میں جا بیٹھتے اور باقی کرتے کرتے ہندے کے ذریں آکر تھوڑی دیر کے لیے دیہن لیٹ کر سوچاتے تو مدن میں دو اکڑاً اُنمی کہ جیسے زمیں کا سینہ پچاڑ کر جائے گا۔ بچھے کبھی کیتے دیکھ کر پھر بچھل نہردار نے چھاۓ کہا تھا، رکھ کے کے جسم پر اس کی بولتی تک نہیں تاروں کے ہوئے ہوئے رہتے۔ تہارے جسم کو کسی کی نظر لگکر نہیں ہے، باہمیں نے کہا تھا۔ بڑی لمبی نظر لگی ہے۔ میرے پاؤں شن ہو گئے ہیں۔ کالج کے دوسرے سال میں بشیر کا شہر کے رہتے میں اُس کے چھپا کے میلوں نے کھہاڑیوں سے کاٹ کر کھیتوں میں چینیک دیا تھا۔ میں اسے دیکھنے لگا تھا مگر سوگز سے اُس کے کپڑوں کے نشان دیکھ کر جلا اُنمی تھا۔ اور کوئی نہر پر پھرپت، سرراستے ہوئے باوں والی رنگوں کے نیم رنگ اشارے اور رنگوں کی بلکل بچکی آہیں، ہر وقت کہ زمیں اور نیلے طاعم کا نقہ پر محنت سے لکھتے اور پچاڑے ہوئے ان گہنے خط ختم گئے تھے مگر ان باؤں کی کوئی حقیقت نہیں۔ سرن کے ہوئے دن یا مجنت کرتے ہوئے سدا بہار ہیں۔ ان چیزوں کا زنگ کبھی میلا نہیں ہوتا۔ جیپ اب دوبارہ چل پڑی ہے۔ آگئے پردہ پھر گریا ہے۔ میں تو قیدی ہوں، مگر ان دونوں میں کبھی اچھی سزا ملی ہے۔ باہمیں دیکھ سکتے۔ چھپ بیٹھے مگر لیٹ پی۔ ہے ہیں۔ میں ان سے کئی بات کر دیں ہے اب رات ختم ہونے والی ہوگی۔ کچھ دیر ہیں دن انکل آئے گا۔ پھر کوئی نہ کوئی منزل آئے گا۔ باہمیں نے میری شکل بھی نہیں دیکھی تھی، مگر اُنمی تھی۔ میں وہاں پہنچنے کے لئے کافی تھا۔

کھڑا تھا، اور شام کے اندر صیرے میں دوسرے چند لمحوں کے لیے اُس کی نظر بجھ پر پڑی تھی۔ بس اتنی بات ہوئی تھی۔ میں یا سہیں کو کیسے یاد کروں۔ یک خشننا اور دیر پا خدپ کہاں سے لاوی، جو اُس کا اہل ہو۔ . . . . . اس کے دل میں ایک ہوک اٹھی۔ اس ہوک سے گروپا اپنک ایک ٹیکم ٹوٹ گیا۔ اس پر اب یہ حقیقت کھل کر وہ کرن سی ایسی منزل تھی جس کی سیر صور کے طویل سلسلے کو ٹے کرنا ہوا دہ یہاں تک پہنچا تھا۔ ایک ایک سیر صور پر جما جما کر قدم رکھتا ہوا، زندگی کی چھپی اور چھپائی ہوئی صور کراہتا، آن کے اوپر سے ترک کے پردے اتارنا ہوا وہ اس ایک منزل کی تلاش میں چلا جا رہا تھا کہ یا سہیں کو کیسے یاد کرے۔ سب نئی سئی بائیں نیم جان تھیں۔ چل جان تو اس اندر والی خود گھٹھی میں بند تھی جو بھل کے جھپا کے میں تیر دھار پھل کی طرح چکتی ہے۔ سرف بحث کرتے ہوئے بدنا، اس نے اڑان تیز کرتے ہوئے خوشی سے سوچا، سدا بھار ہیں۔ اس وقت جیسے میں چارپائی پر لیٹا لائیں کہ روشنی میں کہے کی چھست پر ایک ایک سایے کو دیکھ رہا تھا تو میرے اوپر بھل دہ کہہ رہی تھی، ہائے اس میں، تمہاری چلد پستان پر گئے ہیں، ظالموں نے کیا کیا ہے۔ اس کے ہونٹ میری گردن اور میلنے اور پیٹ کی ٹہیوں کے نشیب تلاش کر رہے تھے۔ اس وقت میں اپنک اپنے آپ سے بھل کر چارپائی سے پرے جا کھڑا ہوا تھا اور اوپر سے جیسے آن دو گوشت پرست کی شیہوں کو ایک دوسرے سے پہنچتے اور جدرا ہوتے ہوئے دیکھنے لگا تھا جیسے تیر ہوا کے اندر دبے دم لٹکتی پیلیں ہوں اور ہونٹ میری چلد کے نٹ انوں کے اوپر اور سر کتے جاتے تھے، پسلیوں کے پنجھر کے اس پاس اور نات کی بلوٹ کے اندر زبان کی نم نوک الحجر کو کندق ہوئی، کوئی کی انجھری ہر فی ٹہی کو ما تھد دلاسے کی طرح دھاپتے ہوئے اور دم بھین اور گول بادامی آنکھیں تیرے کی کنی کی مانند میری رانوں کی چلد کے اوپر اور تیز سیدھی لکھیریں کھینچے جاتی تھیں۔ ان لکھیریں کی سنساہش سے رؤیں کانٹوں کی طرح کھڑے تھے جن کی جزوں میں سر پہٹ دوڑتی ہوئی جان کی جلد بہترین ریشم کی سی ٹکنی اور نازک اور مضبوط بنسنے کی تھی، اور سرکشی سے سراٹھے اس کے ہنڑوں کے ریشم سے آنکھ ملاسے کھڑی تھی جیسے کہتی ہو کہ دنیا کی کسی اور شے پر، پچوال پر یا تر شے ہوئے پھل پر اپنا ما تھر کھ کر یا ہونٹ لگا کر دیکھ لو ایسا بیش بہاء ہرگا، ان لمبی لمبی سرکن ہر فی انگلیوں کے پوروں سے اپنی جان میری آنکھ میں ٹپکا دیں تمہارا بدل ہوں میں تم ہوں تم جیسا ہوں، کہ یک بارگی میرے ہدن سے ایک چینخ برآمد ہوئی اور اچھاں مار کے انگلیوں کے پوروں کو متینگر کرتی ہوئی اُس کی آنکھوں کو دھکتی چلی کنی، اور اس تیر کی سی چینخ کے مقابل وہ ایک لمحہ برابر سر کی نہ اپنی جگہ سے ملی بلکہ آنکھوں پر اور دھار پر اور کندھے کی گرلائی پر اس پھٹلے ہوئے میتوں کی لکیر کو اٹھنے کے حرکت درخت میٹھی رہی اور پہاڑ

کا ایک سست نظر خمار اُس کے جزوں سے پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگا تھا۔ صبح سریرے دو آنکھیں میرے دیکھتے ہی دیکھتے مٹھپر گئی تھیں اور میں نے نظر کی شعاع کر شیشے میں بولتے ہوئے دیکھا تھا جب منہ اندھیرے گرم سوتے سوتے ابا نے اک رنجھے جگایا تھا۔ آنکھیں کھول کر میں نے دیکھا تھا کہ پتا نہیں میں کہاں پر ہوں اور ابا ایک چمکتا ہوا چھڑا تھا میں لیے میرے اور پھر ہے میں پھر میں نے دیکھا کہ میں بتر ہیں لیا ہوں اور ابا نے ابا تھا بڑا کر یہ سر پر پھرا ہے اور بال درست کیے ہیں اور جھک کر گال کر جما ہے اور پھرے والا ابا میرے اگے بڑھا دیا ہے۔ اس کو با تھوڑا دارہ ابا نے کہا اور میں اسے چھونے کی بجائے کھیس کے کچھ اور اندر سرک گیا تو ابا میرے سر پر با تھوڑا کر پیدا رہے بولے، بس دستے کو با تھوڑا دو ٹیکے، اور سو جاؤ۔ اہمروں نے پھرے کا پھل موڑ کر اپنی طرف کر لیا اور کلڑی کا دستہ میری جانب بڑھا کر درسے ابا تھے میرا با تھوڑا اور دستے سے پھر کر پھوڑ دیا۔ پھر وہ بہر نکل گئے۔ اب سو جاؤ، وہ جائے جاتے کہہ گئے، مگر ان کے باہر جاتے ہی میں بتر سے نکل کر ان کے پیچے پیچے چلا آیا اور آسمان پر ہاول تھے یا صبح سریرے کا وقت، تھیک یاد نہیں، مگر دن کا آجالا بھی کم تھا۔ ہماسے پکنے صحن میں نال کے اور پر موتی کو بچھا رہے ایک آدمی اُس کے اور پر میخا تھا اور ابا وہ چھرا اُسے دے رہے تھے۔ یہ بڑی عید کا دن تھا۔ مرقی ہمارا بکرا تھا جس کے لگے میں بڑے بڑے سفید متپوں کا پیاس تھا۔ میں روز شام کو رستی کپڑا کر اسے صحن میں پھرنا تھا اور ابا کہتے تھے یہ تمہارا قربانی کا بکرا ہے۔ مجھے علم تھا کہ یہ پر اقربانی کا بکرا ہے مگر مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ ہر روز شام کو میں رستی کپڑا کر نے سے صحن میں گھمایا کرتا تھا اور اب میں جا کر اُس کے منہ کو با تھوڑی لگایتا تھا اور وہ مجھے کچھ نہیں کہتا تھا۔ جب اس روز صبح سریرے قصائی نے مرقی کر پھر کر اسے ذبح کیا تو میں ڈر کر یہ پھر بہنے کی بجائے اگے نکل کر بابا کے پاس جا کر ہوا اور کافیتے ہوئے نفرے کر اور نالی میں بہتے ہوئے خون کو دیکھنے لگا۔ وہ شاید پھلا موقع تھا جب میں اپنے آپ میں سے نکل کر الگ کھڑا ہو گیا تھا اور غور سے ان آنکھوں کو دیکھ رہا تھا جو میرے دیکھتے دیکھتے بن گئی تھیں۔ آنکھیں چمک بربر قائم رہی تھی اور ان کی شکل میں کوئی تبدیلی نہ اُتی تھی، مگر صاف دکھائی دیتا تھا کہ نظر کیمیں مٹھپر گئی ہے۔ یہ میری پہلی قربانی تھی۔ وہ آنکھیں پہلے بھی ہوا ہیں دیکھ رہی تھیں اور اب بھی دیکھے جا رہی تھیں مگر دیکھتے دیکھتے خالی ہر گئی تھیں۔ اس سے مجھے پتا چلا کہ ہوا کیا ہوتی ہے۔ باہمیں نے کہا تھا، اسے می، نام نے بڑے دکھ انھلے ہیں، مگر یہ تو کوئی بات نہیں۔ میں اپنی سالس کے عارضے کی خاطر اور صراحت پر ادا ہوں گو ایسے ایسے عارضے کس کو نہیں ہوتے۔ صرف اتنی بات ہے کہ اس بھلی کی چمک کو میں قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اس وقت تک کتنا مہوں گا جب تک میرے دل میں زور ہے۔ بس اتنی بات ہے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جن کو اشارہ دلتا ہے کہ وہ دوزخ میں جائیں گے اور وہ اسے تسلیم کر رہتے ہیں، مگر نابت قدم رہتے ہیں۔